pISSN:0000-0000
eISSN:0000-0000

OPEN ACCESS

شیراز منظور ساگرؔ
لیکچرار پنجاب کالج وزیر آباد
ڈاکٹر محمد قاسم
شعبہ اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

Sheraz Manzoor Sagar
Lecturer Punjab College Wazirabad
Dr. Muhammad Qasim
Dept. of Urdu Allama Iqbal Open University Islamabad

گلزار کی نظموں میں وقت کا تصور

Concept of Time in The Poems of Gulzar

Abstract:

Samporan Singh Kalra known as Gulzar is a well-known and multidimensional personality: scriptwriter, film director, short story writer, lyricist, and poet. Time plays a vital role in his poetry. He thinks and expresses different ideas of time in his poetry. Sometimes his poetry expresses his nostalgic mood and sometimes he portrays a bitter picture of the past.

گلزارؔ ایک ہمہ جہت شخصیت ہے جس نے فلمی کہانیاں لکھی، ڈائیلاگ لکھے، اسکرپٹ رائٹر کے طور پر بھی کام کیا اور ڈائریکٹر کے طور پر بھی بے شمار یادگار تخلیقات فلم انڈسٹری کو دیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ نغمہ نگاری اور افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے ۔مذکورہ بالا آرٹ کے تمام شعبے اور اُن میں ہونے والا کام ایک طرف مگر بنیادی طور پر گلزارؔ شاعر ہیں۔ اُن کی تمام صلاحیتوں کا منبع شاعری ہے۔ یوں تو گلزار کے موضوعات کا کینوس بہت وسیع ہے مگر اُن کی شاعری میں حوادث و واقعاتِ زمانہ سے پیدا شدہ احساسات کی ترجمانی ، ہجرت اور ہجر کے تاثرات، تہذیب کا نوحہ اور ماضی کی متعدد تصویریں مل جاتی ہیں۔

گلزارؔ کی شاعری میں وقت بھی اہم کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔ وقت ایک ایسا گورکھ دھندہ ہے جسے آج تک کوئی سمجھ نہیں پایا۔ طبیعیاتی سائنسدانوں نے بارہا کوشش کی ہے اور اپنے اپنے دلائل بھی دیے ہیں۔ کسی نے کہا کہ کائنات بغیر وقت کے بھی ہو سکتی ہے اور کسی نے اس کی تردید کی۔ وقت کیا ہے؟ یہ کب شروع ہوا؟ اور کب اس کا اختتام ہو گا؟ یہ سوالات ابھی تک تشنہ ہیں اور سائنسدان بھی اس کے بارے میں متذبذب ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وقت کے بارے میں گہرے غور و خوض کی ضرورت ہے۔ دراصل کائنات میں کچھ

واقعات فطری طور پر اپنے آپ کو مسلسل دہراتے رہتے ہیں، جن سے وقت گزرنے یا بدلنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چاند، سورج اور زمین کی اپنی حرکت اور اُن میں روشنی، حرارت اور کشش کے اعتبار سے باہمی واقعاتی ربط جس کی بدولت دن رات، ماہ و سال اور سال کے چار موسموں کا تعین ٹھیک ٹھیک ہوتا ہے۔ یہ واقعاتی تکرار اور کائنات میں مستقل طور پر ہونے والا تغیر اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت کسی مقام پر ٹھہرتا نہیں۔ یہ صرف واقعات کا ایک تسلسل ہے جو انسان کو پیدائش سے لے کر مرنے تک ماحولیاتی اثر کی وجہ سے بہت گہرائی کے ساتھ انسانی ذہن میں قائم رہتا ہے۔ درحقیقت خدا نے انتہائی درستی کے ساتھ، موزونیت اور معقولیت کے ساتھ اس کائنات کے لیے ایسے واقعات کی تکرار پیدا کی ہے جس سے انسان اپنے نظم وضبط کو درست رکھ سکتا ہے۔ انسان اپنے افعال اور معمولاتِ زندگی کو کائنات کی واقعاتی تکرار سے ہم آہنگ رکھ کر ایک منظم زندگی گزار سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وقت صرف ایک ضمنی تاثر ہے جس کا کوئی ٹھوس وجود نہیں۔ مگر پھر بھی نئے دور کا انسان اسے اہمیت دیتا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے ایک بھید بنا کر رکھ دیا ہے۔ جاوید اختر جاویدؔ کی بھی ایک نظم وقت کے حوالے سے ہے جس کا عنوان ہے "یہ وقت کیا ہے؟"۔ اس کے چند مصرعے دیکھیے:

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ چلتی گاڑی سے پیڑ دیکھو
تو ایسا لگتا ہے دوسری سمت جا رہے ہیں
مگر حقیقت میں پیڑ اپنی جگہ کھڑے ہیں
تو کیا یہ ممکن ہے؟ ساری صدیاں قطار اندر قطار اپنی جگہ کھڑی ہوں
یہ وقت ساکت ہو اور ہم ہی گزر رہے ہوں؟
اس ایک لمحے میں سارے لمحے
تمام صدیاں چھپی ہوئی ہوں
نہ کوئی آئندہ.. نہ گزشتہ
جو ہو چکا ہے.. وہ ہو رہا ہے
جو ہونے والا ہے، ہو رہا ہے
میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے؟
سچ یہ ہو کہ سفر میں ہم ہیں
گزرتے ہم ہیں
جسے سمجھتے ہیں ہم گزرتا ہے، وہ تھما ہے
گزرتا ہے یا تھما ہوا ہے؟
اکائی ہے یا بٹا ہوا ہے؟

ہے منجمد یا پگھل رہا ہے؟
کسے خبر ہے؟ کسے پتہ ہے؟
یہ وقت کیا ہے؟(۱)

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ دراصل "وقت" کا کوئی وجود نہیں۔ اگر اس کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کے آغاز و انتہا کا تعین کرنا ناممکن ہے۔ اگرچہ اس کو ناپنے کے لیے سیکنڈ، منٹ اور گھنٹے بنائے گئے ہیں مگر پھر بھی سہی طور پر اس کو ناپا نہیں جا سکا۔ اور شاید کسی اور سیارے پر رہ کر ناپا جائے تو ہماری گھڑیاں ہمارا ساتھ نہ دیں۔ مگر سائنسدانوں، مفکروں اور دانشوروں نے اس کے وجود کو تسلیم کر کے اس کے بارے میں کھوج لگانے کی ناکام کوشش کے بعد اسے ایک معما قرار دیا ہے اور اسی سوچ کی پیروی کرتے ہوئے شعرا نے بھی اس کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جاوید اختر جاوید کی طرح گلزارؔ نے بھی وقت کو پکڑنے کی لاحاصل کوشش کی ہے۔ اس کی نظم "وقت۔۱" دیکھیے:

میں اڑتے ہوئے پنچھیوں کو ڈراتا ہوا
کچلتا ہوا گھاس کی کلغیاں
گراتا ہوا گردنیں ان درختوں کی، چھپتا ہوا
جن کے پیچھے سے
نکلا چلا جا رہا تھا وہ سورج۔۔۔۔۔
تعاقب میں تھا اس کے میں!
گرفتار کرنے گیا تھا اسے
جو لے کے مری عمر کا ایک دن بھاگتا جا رہا تھا۔(۲)

یہاں گلزارؔ نے سورج کو وقت کا استعارہ بنایا ہے اور اسے پکڑنے کی کوشش میں ہے کیونکہ روز سورج آتا ہے اور اُن کی زندگی سے ایک دن چھین کر لے جاتا ہے۔ گلزارؔ کی اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان سراپا مجبور اور لاچار ہے، اسے کوئی اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو ڈوبنے سے بچا لے یا اپنی زندگی کا ایک دن ڈوبنے سے بچا لے۔ گلزارؔ نے بھی وقت کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کی کوشش کی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ وقت کے سامنے مغلوب ہوں گے مگر کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ دراصل گلزارؔ نے انسان کی یہی شکست خوردگی دکھانے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ اسی موضوع پر اُن کی ایک اور نظم "وقت۔۲" پڑھیے:

وقت کی آنکھ پہ پٹی باندھ کے، کھیل رہے تھے آنکھ مچولی!
رات اور دن اور چاند اور میں!
دور گرا جا کر میں، جیسے

روشنیوں کے دھکے سے
پرچھائیں زمیں پر گرتی ہے
دھیا چھونے سے پہلے ہی
وقت نے چور کہا اور آنکھیں کھول کے
مجھ کو پکڑ لیا!(۳)

مذکورہ نظم میں بھی گلزارؔ نے وقت کے ہاتھوں انسان کی پامالی کو ظاہر کیا ہے۔ آنکھ مچولی ہماری ثقافت میں ایک مقبول کھیل ہے جو اکثر بچے کھیلتے ہیں۔ ایک کی آنکھ پر پٹی باندھ دی جاتی ہے جو اسی حالت میں دوسروں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی اُس کے ارد گرد رہتے ہیں اور اُس کی گرفت سے بچنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ کبھی اُسے ہاتھ لگا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور کبھی دھکا دے کر بھاگ جاتے ہیں۔ گلزارؔ نے اس کھیل کو رات، دن اور چاند کی مدد سے کھیلا ہے جس میں یہ چاروں مل کر وقت کی آنکھ پر پٹی باندھتے ہیں۔ گلزارؔ کے مطابق رات، دن اور چاند وقت کو بار بار چھونے کے باوجود پکڑے نہ گئے مگر وہ خود وقت کو ابھی چھو بھی نہ پائے تھے کہ گر پڑے اور وقت نے کھیل کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آنکھیں کھول کر اُن کو پکڑ لیا۔ یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ وقت کو آج تک کوئی پکڑ نہیں پایا مگر وقت جب چاہے انسان کو پکڑ کر بے بس کر دیتا ہے۔

گلزارؔ کے نزدیک وقت زندگی کو تاراج کرنے والا ہے، رات اور دن، سورج اور چاند کی حرکت کا نام وقت ہے۔ اُن کے نزدیک پوری کائنات کی تغیر پذیری کا محرک وقت ہے۔ بقول ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط :

"گلزارؔ کے نزدیک وقت حیرت و استعجاب میں اڑتے ہوئے چہرے کے رنگ کی طرح ہے۔ وہ سمندر میں اٹھتے ہوئے بخارات کی طرح ہے جو اٹھتے تو ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک وقت گردشِ لیل و نہار کا غلام ہے جو سورج کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے مشرق سے مغرب تک پھرتا رہتا ہے"۔(٤)

تہذیبی نقوش اور تاریخی مقامات گذشتہ زمانے کی زندہ علامت بن کر حساس اور دانش مند لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ گلزارؔ کی ایک طویل نظم "وقت۔۳" جس میں انھوں نے آثارِ قدیمہ اور تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں وقت کے نقوش ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جانتے ہیں وقت گزر رہا ہے مگر پھر بھی نہیں گزرتا، وہ وقت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ جب بھی وقت کو ایک پرندہ سمجھ کر کلائی سے باندھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وقت تو اُڑ چکا ہے۔ انھوں نے وقت کو گردشوں کا غلام اور انسان کو وقت کا غلام قرار دیا ہے۔ نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجیے :

قدیم وزنی عمارتوں میں
کچھ ایسے رکھا ہے جیسے کاغذ پہ بٹّا رکھ دیں
دبا دیں، تاریخ اڑ نہ جائے

میں وقت کیسے بیاں کروں، وقت اور کیا ہے؟
کبھی کبھی وقت یوں بھی لگتا ہے مجھ کو جیسے غلام ہے
آفتاب کا اک دہکتا گولا اٹھا کے ہر روز پیٹھ پر وہ فلک پہ چڑھتا ہے چپّہ چپّہ قدم جما کر
وہ پورا کہسار پار کر کے
اتارتا ہے، اُفق کی دہلیز پر دہکتا ہوا سا پتھر
ٹکا کے پانی کی پتلی سُتلی پہ، لوٹ جاتا ہے اگلے دن کا اٹھانے گولہ
اور اس کے جاتے ہی
دھیرے دھیرے وہ پورا گولہ نگل کے باہر نکلتی ہے
رات اپنی پیلی سی جِیب کھولے
غلام ہے وقت گردشوں کا
کہ جیسے اس کا غلام ہوں میں!!(۵)

کہتے ہیں وقت اور لہر کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ انسان واقعی وقت کا غلام ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ جوان رہے گا، زندہ رہے گا مگر وقت ہے کہ آہستہ آہستہ سال پر سال بہا کر لے جاتا ہے اور انسان سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے جب اُس نے دیوار پر نیا کیلینڈر لگایا تھا، ابھی چند دن پہلے ہی تو اس نے ڈائری کے پہلے صفحے پر سارے سال کی پلاننگ لکھی تھی کہ فلاں دن، ہفتے یا مہینے فلاں کام کرنا ہے مگر وہ دن کیسے گزر گئے اسے کوئی پتہ ہی نہیں چلتا۔ وقت انسان کی گرفت میں نہ کبھی آسکا ہے نہ کبھی آئے گا۔ نہ انسان اسے کبھی سمجھ پایا ہے نہ سمجھ پائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ وقت گزر جاتا ہے مگر دیکھا تو یہی گیا ہے کہ وقت ٹھہرا رہتا ہے انسان "گزر" جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وقت کبھی ختم نہیں ہو گا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وقت کا کوئی انجام نہیں اور جس کا کوئی انجام نہیں اس کا آغاز کیسے ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ وقت ایک راز ہے جو صرف خدا ہی جانتا ہے۔

گلزارؔ کی نظموں میں وقت کا احساس اُس کے سب سے زیادہ نمایاں موضوع "ماضی" میں ضم ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماضی کا پیچھا کرتے ہوئے بھی وقت کا احساس گلزار کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ماضی کے حوالے سے جن نظموں کا آئندہ ذکر آئے گا، اُن میں وقت کے ہاتھوں انسان کی پامالی کا بھی ذکر آئے گا۔

انسانی فطرت ہے کہ انسان کو ماضی ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ماضی چاہے جیسا بھی ہو مگر ماضی کی یادیں ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ماضی کے صرف خوشگوار لمحے ہی یاد رکھنا چاہتا ہے اور تلخ و ناخوش گوار لمحوں کو بھلا دینا چاہتا ہے۔ گلزارؔ اس حوالے سے بھی منفرد ہیں کہ وہ اپنی نظم میں ماضی کے خوشگوار اور ناخوشگوار، ہر طرح کے لمحات کو یاد رکھتے ہیں۔ ایک طرف "دینہ" ہے جس کی ہر یاد اُن کی دھڑکن کو تیز کر دیتی ہے اور ایک طرف ارضی تقسیم اور ہجرت ہے جن کی یادیں اُن کی دھڑکن کو

روک لیتی ہیں۔ گلزار بہر حال ماضی کو محبوب جانتے ہیں۔ ماضی کے پھولوں سے اپنی یادوں کو خوبصورت اور معطر بنا دیتے ہیں، ماضی کے کانٹوں سے اپنے زخموں کو رفو کرنے کا جتن بھی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ماضی کو اپنی شاعری کا استعارہ بنالیا ہے۔ یہ ماضی صرف اُن کا اپنا ماضی نہیں بلکہ پوری انسانیت کا ماضی ہے۔ وہ اِس ماضی میں اپنے حال کی کھوج لگاتے ہیں۔ وہ جب چاہیں ماضی کی گلیوں میں آوارہ گردی کرنے چلے ہیں اور جب لَوٹتے ہیں تو ماضی کو اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر شکیل الرحمٰن:

"گلزار کا رومانی ذہن بھی ماضی کو عزیز جانتا ہے، ماضی کے حسن کو اپنی یادوں کا حصہ بنالیتا ہے۔ ماضی کی مسرتوں اور ماضی کی اداسیوں کو ذرہ ذرہ چنتا ہے۔ ان سے خود بھی جمالیاتی آسودگی حاصل کرتا ہے۔ گلزار کی شاعری کا یہ وصف توجہ کا مرکز بن جاتا ہے، عشق کا جذبہ شاعر کو کبھی تاریخ اور تہذیب کے پرانے کھنڈر میں اتارتا ہے اور کبھی محبوب کی یادوں کی تہہ دار گہرائیوں میں، دونوں صورتوں میں المیہ رجحان اہمیت اختیار کرلیتا ہے، سرد آہیں اداس اداس فضاؤں اور لمحوں میں محسوس ہوتی رہتی ہیں۔ پرانے کھنڈر ہوں یا محبوب کی یادیں درد کے رشتے کا احساس دلاتا رہتا ہے"۔(٦)

گلزار زندگی کو ایک کھنڈر کے طور پر دیکھتے ہیں جس میں عظیم صدیوں کی راکھ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ زندگی کے ان کھنڈروں میں جانے کتنے پُر مسرت لمحے، غم کی ساعتوں میں تبدیل ہوئے ہیں، جانے کتنے روشن چہرے بجھ چکے ہیں، جانے کہاں کہاں اور کس کس پر کون کون سے واقعات ہو گزرے ہیں۔ اگلی صدیوں کے کتنے تجربات و واقعات ہیں جو ان کھنڈروں میں دبے ہوئے ہیں۔ نظم "کھنڈر" ملاحظہ کیجیے:

میں کھنڈروں کی زمیں پہ کب سے بھٹک رہا ہوں
قدیم راتوں کی ٹوٹی قبروں کے میلے کتبے
دنوں کی ٹوٹی ہوئی صلیبیں گری پڑی ہیں
شفق کی ٹھنڈی چتاؤں سے راکھ اُڑ رہی ہے
جگہ جگہ گُرز وقت کے چُور ہو گئے ہیں
جگہ جگہ ڈھیر ہو گئی ہیں عظیم صدیاں
میں کھنڈروں کی زمیں پہ کب سے بھٹک رہا ہوں
یہیں مقدس ہتھیلیوں سے گری ہے مہندی
دیوں کی ٹوٹی ہوئی لویں زنگ کھا گئی ہیں
یہیں پہ ماتھوں کی روشنی جل کے بجھ گئی ہے
سپاٹ چہروں کے خالی پتے کھلے ہوئے ہیں
حروف آنکھوں کے مٹ چکے ہیں

میں کھنڈروں کی زمیں پہ کب سے بھٹک رہا ہوں
یہیں کہیں زندگی کے معنی گرے ہیں اور گر کے کھو گئے ہیں (۷)

مقدس ہتھیلیوں سے مہندی گرنا، دیوں کی لَو کا زنگ کھانا، ماتھوں کی روشنی کا جل بجھنا، آنکھوں کے حروف کا مٹنا اور وقت کے گرزوں کا چور چور ہونا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز فنا کی جانب گامزن ہے۔ ہر عروج کو زوال ہے، ہر بہار کو خزاں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر پھول کو مرجھانا پڑتا ہے، مہر و ماہ نے بھی بالآخر ڈوب جانا ہے۔ درحقیقت شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کو بیان کیا ہے اور زندگی کو بے معنی گردانا ہے۔ یہ وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ یہاں بھی وقت نے اپنی حاکمیت اور غلبے کا احساس دلایا ہے۔ وقت جب بدلتا ہے تو آسمان پر اُڑنے والے بھی زمین پر پٹخ دیے جاتے ہیں۔ وقت نے پھولوں کی رفاقت میں رہنے والوں کو کانٹوں پر سلایا ہے۔ سنگِ مرمر پہ چلنے والوں کو پتھر کی دیواروں میں قید کروایا ہے۔ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے والوں کو دھول چٹائی ہے۔ اطلس و کمخواب زیبِ تن کرنے والوں کو چیتھڑوں تک پہنچایا ہے۔ ناز و نعم سے پلنے والوں کو کوڑی کوڑی کا محتاج کیا ہے۔ تخت پر بیٹھنے والوں کو تختے تک پہنچایا ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہ، سورما اور راجہ مہاراجہ جنھوں نے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک راج کیا ہے وہ بھی وقت کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔

وقت ماضی ہے، حال ہے اور مستقبل ہے۔ یوں تو آنے والا وقت بھی ماضی میں بدلنے والا ہے مگر وہ وقت جو گزر کر ماضی کا حصہ بن چکا ہے اس کے نقوش ڈھونڈھنا اور خد و خال نمایاں کرنا گلزار کی شاعری کا خاصہ ہے۔ گلزار کی ایک نظم "وقت" ماضی کی شان و شوکت اور بربادی کی داستان سنا رہی ہے جس سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے:

اور گائیڈ بتا رہا تھا ہمیں
شاہ عالی کی خواب گاہ تھی یہ
ہیرے موتی جڑے پلنگ تھے یہاں
سچے موتی سے اُن دریچوں پر
چلمنیں ٹانگی جایا کرتی تھیں
وہ نشاں گن کے دیکھیے چھت پر
نو سو پینتیس کانچ کے فانوس
رات میں جگمگایا کرتے تھے
جشنِ شعر و شراب رہتا تھا
رات بھر رقص چلتے رہتے تھے
سات سو بارہ اونٹوں پر لد کر

ملکِ ایراں سے آئے تھے قالین
گُلبدن بیگمات۔۔۔ کہتے ہیں
پاؤں رکھتیں تو ڈوب جاتے تھے
رات دن ان کے قہقہوں سے محل
تان پورے سے گونجا کرتا تھا
وہ زمانے ہی اور تھے صاحب
کہتے کہتے ہجوم کو لے کر
بڑھ گیا مقناطیس کا ٹکڑا
اب کھنڈر میں کھڑا ہوں میں تنہا (۸)

وقت کی آندھی ہر تہذیب کا، ہر فاتح کا اور ہر عروج کا نام ونشان مٹا دیتی ہیں۔ پھر وقت کی بے رحم ضربوں سے گھائل ماضی آخری سانسیں لیتا نظر آتا ہے اور آخر کار ماضی کے نقوش بھی دم توڑ دیتے ہیں۔ ماضی سے جُڑی کچھ داستانیں کتابوں میں رہ جاتی ہیں اور کچھ سینہ بہ سینہ چلتی ہیں۔ انھیں داستانوں میں سے ایک داستان مذکورہ بالا نظم میں بیان کی گئی ہے۔ ایک گائیڈ کی زبان سے گلزارؔ نے جو ماضی کی داستان سنائی ہے وہ سبق آموز بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ ایک عالی مرتبت بادشاہ کی خواب گاہ کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ہیروں اور موتیوں سے جڑے آرام دہ پلنگ، دریچوں میں سجے موتیوں کے پردے، سینکڑوں فانوس جن کی روشنی سے رات میں بھی دن کا ساسماں پیدا ہو جائے، شعر و شراب کا دور اور رقص و سرود کی محفلیں، سینکڑوں اونٹوں پر لاد کے لائے ہوئے گداز ایرانی قالین کہ جو پھولوں جیسی بیگمات کے پاؤں رکھنے سے بھی دب جائیں، اُن بیگمات کی سریلی اور مدھ بھری آوازوں اور قہقہوں سے محل گونج اٹھے۔ اس منظر کشی کے بعد گائیڈ آگے بڑھ جاتا ہے مگر شاعر وہی کہیں ماضی کے نقش و نگار کی کھوج میں لگ جاتا ہے۔ وہ خواب گاہ جہاں شان وشوکت اور عظمت کی داستانیں رقم ہوئیں وہاں آج سوائے جھینگر کی صدا کے اور کچھ نہیں۔ وقت کی بے رحم موجیں سب کچھ بہا کر لے گئیں۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ گلزارؔ ماضی میں لے جاتے ہیں اور پھر ماضی کا تعلق حال سے اس طرح جوڑتے ہیں کہ ماضی و حال ایک ہو جاتے ہیں۔ اُن کی فلموں اور کہانیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی نظموں میں بھی "فلیش بیک" کی تکنیک استعمال کی گئی ہے جو کہ اُن کی پسندیدہ ہے۔ فلیش بیک کا مطلب ہے کہ کسی سابقہ منظر کی طرف لوٹنے کا عمل۔ وہ پہلے قاری کو ماضی میں لے جاتے ہیں اور ماضی کی شان وشوکت، امارت، رنگینیاں، ماحول، چمک دمک کے ساتھ جبر واستحصال اور بربریت کے مناظر بھی دکھاتے ہیں اور پھر اسے حال کے ساتھ ایسے جوڑتے ہیں کہ قاری دم بخود رہ جاتا ہے۔ اُن کی نظم "پومپیئے" اس کی خوبصورت مثال ہے جس میں وہ ایک پرانے شہر کی کھدائی کا ذکر کرتے ہیں جہاں سے تواریخ کے ٹکڑے اور پوشیدہ تہذیب برآمد ہوتی ہے۔ پھر اُس تاریخ کے ٹکڑوں کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

وہی مٹکے، وہی ہانڈی، وہی ٹوٹے پیالے

ہر جگہ ملتی ہیں انساں کی تمدّن گاہیں
ہونٹ ٹوٹے ہوئے، لٹکی ہوئی مٹی کی زبانیں ہر سُو
یعنی اُس وقت بھی تھی بھوک بھی اور پیاس بھی اور پیٹ بھی تھا
سونے چاندی کے جڑے بکس تھے زیور سے ٹھُنسے
حکمرانوں کے محل، ان کی فصیلیں، سکّے
رائج الوقت جو ہتھیار تھے اور اُن کے مرصع دستے
بیڑیاں پتھروں کی، آہنی پیروں کے کڑے
اور غلاموں کو جہاں باندھ کے رکھتے تھے
وہ پنجرے بھی بہت سے نکلے
ایک تہذیب یہاں دفن ہے اور اس کے قریب
ایک تہذیب رواں ہے کسی دریا کی طرح
جو مرے وقت کی ہے۔(۹)

اور ان مصرعوں کے بعد وہ اپنی موجودہ ترقی یافتہ تہذیب کو بیان کرتے ہیں اور طنزیہ لہجے میں ماضی و حال میں ہونے والی تبدیلی کا ذکر کرتے ہیں۔ آخری مصرعے دیکھیے:

حکمراں بھی ہیں ، محل بھی ہیں ، فصیلیں بھی کئی
جیل خانے بھی ہیں اور گیس کے چیمبر بھی ہیں
بینک کے لاکروں میں ہیرے جواہر کے ہیں ڈھیر
ہیروشیما پہ کتابیں بھی سجا رکھی ہیں
میری تہذیب نے اب کتنی ترقی کی ہے
بیڑیاں آہنی ہتھکڑیاں بھی اسٹیل کی ہیں
اور غلاموں کو بھی آزادی ہے ، باندھا نہیں جاتا
میری تہذیب نے اب کتنی ترقی کی ہے (۱۰)

مذکورہ مصرعوں میں آج کے دور کے انسان کی ترقی کو طنز کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جس کی استحصالی سوچ، مادیت پرستی اور نظام آج بھی ویسا ہی ہے بس طریقۂ کار میں بدلاؤ آ گیا ہے جسے انسان نے ترقی کا نام دیا ہوا ہے۔ پہلے لوگ مٹی کے برتنوں میں کھاتے پیتے تھے جبکہ آج کے دور میں شیشے کے برتن استعمال ہوتے ہیں مگر بھوک اور پیاس پہلے جیسی ہے۔ پہلے لوگ سونا چاندی اور ہیرے جواہرات کو بکسوں میں رکھتے تھے جبکہ اب تجوریوں میں اور بینک کے لاکروں میں رکھتے ہیں مگر دولت کی ہوس پہلے جیسی ہے۔ پہلے حکمران محلوں میں رہتے

تھے، تخت پر بیٹھتے تھے جبکہ آج کل بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں، پارلیمنٹ میں جلوہ افروز ہوتے ہیں مگر اقتدار کا لالچ اور دوسروں پر حکومت کرنے کا انداز پہلے جیسا ہے۔ پہلے تلواروں، تیروں اور نیزوں سے جنگ کی جاتی تھی جبکہ نئے زمانے میں بندوق، توپ، ٹینک، میزائل اور ایٹم بم استعمال ہوتے ہیں مگر انسان کی درندگی پہلے جیسی ہے۔ پہلے غلاموں کو پتھر کی بیڑیوں اور پیروں میں آہنی کڑوں کی مدد سے باندھ کر پنجرے میں ڈال دیا جاتا تھا جبکہ آج بیڑیاں اور ہتھکڑیاں اسٹیل کی ہیں اور غلاموں کو باندھا نہیں جاتا مگر آقا بننے کی خواہش پہلے جیسی ہے۔ درحقیقت گلزار کو موجودہ دنیا کی ناہمواریاں، ہوس، ظلم اور جبر و ناانصافی بے حد متاثر کرتی ہیں۔ اس نظم کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کی رائے ہے کہ:

> "پومپیئے کے سینکڑوں برس پرانے آثار کا ذکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ غربت و امارت اور ظلم و جبر کے جو نقشے پومپیئے کی کھدائی میں برآمد ہوئے ہیں وہ آج اس ترقی یافتہ، مہذب اور ماڈرن معاشرے میں بھی پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ گلزار کا عصری اور سماجی شعور اس کی محبت کی ہمہ گیری اور پھیلاؤ کے برعکس بے حد نوکیلا ہے۔"(۱۱)

گلزار کے ہاں ماضی اور حال ایک دوسرے میں ایسے ضم ہو جاتے ہیں کہ قاری کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کب ماضی میں گیا اور کب حال میں لوٹ آیا۔ ماضی کی ساکت یادگاریں اسے اپنے حال کا عکس معلوم ہوتی ہیں۔ ایک نظم "لینڈ سکیپ" دیکھیے:

دور سنسان سے ساحل کے قریب
ایک جواں پیڑ کے پاس
عمر کے درد لیے، وقت کی مٹیالی نشانی اوڑھے
بوڑھا سا پام کا اک پیڑ کھڑا ہے کب سے
سینکڑوں سال کی تنہائی کے بعد
جھک کے کہتا ہے جواں پیڑ سے۔۔۔"یار!
سرد سناٹا ہے! تنہائی ہے! کچھ بات کرو!"(۱۲)

ماضی گلزار کے لیے ہمیشہ سے پرکشش رہا ہے۔ ماضی کے لمحوں میں جینا، ماضی کی یادوں کے سہارے زندگی کرنا، ماضی کو کھینچ کر حال میں لے آنا، ماضی کا حال سے موازنہ کرنا، ماضی اور حال کو یکجا کرنا اور حال اور مستقبل کو بھی ماضی کہنا گلزار کو بہت پسند ہے۔ بعض اوقات وہ ایک ہی وقت میں ماضی، حال اور مستقبل ہوتے ہیں۔ گلزار ہر چیز میں ماضی کی کھوج لگاتے ہیں۔ اس کے خد و خال سے ماضی کے خوشگوار لمحوں کو محسوس کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی پرانی عمارت کو دیکھا تو اس کا ماضی سوچنے لگتے ہیں۔ اس کے بام و در و دیوار کو دیکھتے ہیں، تصور کی آنکھ سے اس کی رونقوں اور شان کو دیکھتے ہیں۔ کھنڈرات کو دیکھتے ہیں تو اُن کھنڈرات میں ماضی کے نقش و نگار کو بھی تلاش کرتے ہیں۔ اس مقام پر وقت نے جو گھاؤ لگائے ہیں انھیں محسوس کرتے ہیں۔ پرانے درختوں، دریاؤں، وادیوں اور راستوں کو دیکھتے ہیں تو اُن سے جُڑی کوئی یاد انھیں گھیر لیتی ہے تو لمحہ حال بھی ماضی بن جاتا ہے۔ پھر نظمیں تخلیق پاتی ہیں، مصرعے سوجھتے ہیں، الفاظ اُترنے لگتے

ہیں اور گلزار کا قلم چلنے لگتا ہے۔ بہر حال گلزار کی اکثر نظموں میں وقت اپنے ہونے کی گواہی دیتا ہے اور بڑے فاتحانہ انداز سے ہر شئے کو پامال کرتا ہوا گزرتا ہے۔ زندگی میں تغیر و تبدل میں بھی سب سے اہم کردار وقت کا ہی ہے جو ہمیشہ سے غالب رہا ہے اور ہمیشہ غالب رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ جاوید اختر: ''ترکش''(سٹار پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی، ۲۰۰۸)ص ۱۳۲

۲۔ گلزار: ''گلزار''(مرتبہ: گل شیر بٹ)،(بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۴)ص ۲۹۷

۳۔ ایضاً، ص ۲۹۸

۴۔ یحییٰ نشیط، سید، ڈاکٹر: '''رات پشمینے کی": تحلیل و تجزیہ'' مشمولہ: سہ ماہی انشا، کلکتہ، (مرتبہ: ف۔ س اعجاز) ص ۱۱۱

۵۔ گلزار: ''گلزار''(مرتبہ: گل شیر بٹ) ص ۲۹۹

۶۔ شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر: ''چاند پکھراج کا'' مشمولہ: سہ ماہی انشا، کلکتہ، (مرتبہ: ف۔ س اعجاز) ص ۹۳

۷۔ گلزار: ''چاند پکھراج کا''(اساطیر لاہور، ۲۰۰۶) ص ۲۸

۸۔ ایضاً، ص ۶۴

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی: دیباچہ: ''چاند پکھراج کا''(اساطیر لاہور، اشاعت ۲۰۰۶) ص ۱۹

۱۲۔ گلزار: ''چاند پکھراج کا''، ص ۲۷